سید قمر عباس کاظمی
لیکچرر، شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج چکوال

''لندن کی ایک رات''، ''گریز'' اور ''اداس نسلیں'' کے نعیم کرداروں کے نوآبادیاتی تہذیبی میلانات

This article attempts to explore the similarities of 'Naeems' the protagonists of these under scrutiny novels i. e, Udasnaslain, Londonkiaikraat and Gurez. All three Naeems visit Europe and observe keenly the European civilization. While comparing this civilization with their own civilization, they come across a cultural dilemma on every step. It has been tried to analyze the common cultural tendencies through the prism of particular colonial culture. Further, it has been focused to identify that all these Naeems are victims of identity crisis and cultural complexities. However, in spite of their staunch inclination towards the Western civilization, they are unable to accept or reject it. So, it discerns that the ambivalence prevailing in the minds of colonized people of that specific era is, in fact, the direct outcome of the imperialistic rule.

نوآبادیات کسی ملک کی سماجیات پر قبضے کے بعد ان کے ثقافتی رشتوں، تہذیبی علامتوں اور تمدنی ماحول نیز تاریخی شعور میں بدلاؤ کا باعث بنتا ہے۔ نوآبادیات جس سماج پر غلبہ پا لیتا ہے وہاں نوآبادکار مختلف طبقوں کو جنم دیتا ہے۔ پہلی صورت میں نوآبادکار خود نوآبادیاتی باشندوں کی زبان اور ان کے تہذیبی عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ فورٹ ولیم کالج کا کردار رہا ہے۔ یہیں سے وہ پہلا گروہ جنم لیتا ہے جو نوآبادکار کی زبان اور ان کی تہذیب سے تو آگاہ نہیں ہوتا لیکن نوآبادکار کی زبان، ثقافت اور علوم کا سخت حمایتی ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے ہی ملک میں نوآبادکار کے علوم، زبان اور تہذیب کو سیکھتے ہیں۔ برصغیر کی مخصوص صورتحال میں اس گروہ کا جنم دلی کالج کی دین ہے۔ تیسرا گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو نوآبادکار کے اصل وطن جا کر ان کی تہذیب اور معاشرت کا براہ راست مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے علوم اور ان کی زبان نوآبادکاروں کی ہمراہی میں سیکھتے ہیں۔ یہ گروہ ایک خاص سطح پر تہذیبی اور نفسیاتی ردعمل کا شکار ہوتا ہے۔ اس مقالے کے موضوع بنائے گئے تینوں ناولوں کے کردار نعیم ایسے ہی کردار ہیں جو یورپ کی مسافت پر جاتے ہیں وہاں کی تہذیب کا براہ راست مشاہدہ کرتے ہیں اور قدم قدم پر اپنی تہذیبی غلامی سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ایک خاص تہذیبی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تہذیب انسانی عادات، افکار، نظریات، خیالات اور نظام اقدار کا جن میں طبعی و معاشی حالات کی وجہ سے تبدیلیاں

آتی رہتی ہیں کا مجموعہ ہوتی ہے یعنی تہذیب کسی معاشرے یا سماج کے مخصوص طرز زندگی کا اظہار ہوتی ہے۔ تہذیب سماج کے مجموعی طرز عمل میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ طرز عمل سماجی ارتقا کے عمل میں ان عوامل سے ظاہر ہوتا ہے جنہیں مذہب، معیشت، فنون و ہنر، سیاست و معاشرت، افکار و نظریات اور سائنس وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ تمام پہلو تہذیبی ادارے ہیں جو کسی سماج کے اجتماعی طرز عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ فرد یا گروہ جس تہذیبی نظام سے وابستہ ہوتا ہے اس کی کارگزاری اس کے ہر عمل سے ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ تہذیبی و ثقافتی شعور کے ذیل میں یہ امر قابل غور ہے کہ جب فرد بطور سماجی اکائی یا سماجی گروہ، اپنے تاریخی عمل میں موجود اپنے ثقافتی و تہذیبی ورثے کی شناخت کرے اور اس کے جامد اور غیر متحرک افعال کو متحرک اور زندہ افعال کے ساتھ تبدیل کرے اور جدید صورتحال کو تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے ہم آہنگ کرے یا ان میں موجود رشتوں کو تلاش کر کے قابل عمل پہلو اختیار کرے تو وہ فرد یا سماجی گروہ تہذیبی و ثقافتی شعور کا حامل ہوگا۔

برطانوی سامراج نے برصغیر کی تہذیبی فضا کو شدید متاثر کیا۔ متاثر کرنے کا یہ عمل دراصل اس لیے ممکن ہوسکا کہ برصغیر پر جب برطانوی سامراج نے اپنے غلبے کو بڑھاوا دیا تو اسے متحدہ ہند کے بجائے منتشر ہندوستانی قومیت کا سامنا تھا گویا یہ فضا سامراجیت کے فروغ میں معاون کا کردار ادا کر رہی تھی۔ اس لیے نوآبادیاتی تمدن جس کی ابتدا عسکری غلبے سے ہوئی تھی جلد ہی برصغیر پر مکمل غلبے کے بعد اپنی تہذیبی اور ثقافتی برتری کے لیے کوشاں ہوگیا۔

تہذیبی ہیجان سامراج کی تہذیبی برتری کا ایک ایسا نتیجہ تھا جس سے برصغیر کی فضا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، اس تہذیبی ہیجان اور تہذیبی رد و قبول کی آویزش اردو ناول کے ہر عہد میں نظر آتی ہے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کا مطمع نظر چاہے اصلاح پسندی ہو لیکن ان کے پیش نظر نئی تہذیبی صورتحال رہتی ہے۔ اسی طرح سرشار اور رسوا جب لکھنوی تہذیب کا المیہ بیان کر رہے ہوتے ہیں تو بھی دراصل وہ نئی تہذیبی صورتحال اور اس کے نتائج ہی ناول کے بیانیے کا حصہ بنا رہے ہوتے ہیں۔

نوآبادیاتی تمدن نے برصغیر میں ہر سطح پر زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ نوآبادی باشندوں کے لیے ان کا ماضی فرسودہ قرار دے دیا گیا۔ نئے علوم وفنون، انگریزی زبان اور تہذیب نوآبادیاتی باشندوں کے لیے آدرش قرار پائے۔ اس طرح برصغیر کے مغلوب سماج نے اپنی معاشرت میں کئی طرح کی تبدیلیاں قبول کرلیں، نئی ایجادات کا ہندوستان میں فروغ ہونے لگا۔ ریلوے کا پورا نظام، سینما، ہسپتال، کالج اور دیگر اعلیٰ تعلیمی ادارے نوآبادکاروں کے مقاصد کو فروغ دینے کا باعث تو تھے ہی لیکن برصغیر کی مجموعی تہذیبی صورتحال میں بدلاؤ پیدا کرنے لگے۔ مقامی موسیقی اور مصوری پر بھی نوآبادیاتی اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے، خرد افروزی اور تعقل پسندی کو فروغ ملا جس کی وجہ سے سماجی و معاشرتی آزادی کے نئے تصورات پیدا ہوئے مثلاً برصغیر میں ادارہ جاتی سطح پر لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا لیکن اب ہندو لڑکیوں کے ساتھ ساتھ عام مسلمان لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ لارڈ میکالے کے مخصوص تعلیمی منصوبے کے باعث بہت جلد بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جس کی بنیادی شناخت تو ہندوستانی تھی مگر وہ اپنے عادات و اطوار کے اعتبار سے انگریز تھا۔ یہی وہ طبقہ تھا جو سامراجی مقاصد کی تکمیل کو اپنا بنیادی فریضہ سمجھتا تھا۔

ناول نگاروں کی وہ نسل جو بیسویں صدی کی ابتدا میں شعور کی عمر کو پہنچی اور بیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائی

میں ان کی تخلیقی زندگی کا آغاز ہوا ان سب پر کسی نہ کسی سطح پر نوآبادیاتی تمدن کے اثرات گہرے ثبت تھے۔ سجاد ظہیر اور عزیز احمد کا تعلق ایک ہی تخلیقی نسل سے ہے۔ دونوں کی تخلیقات نوآبادیاتی عہد میں سامنے آئیں۔ گویا دونوں کے تخلیقی عمل پر نوآبادیاتی اثرات گہرے طور پر موجود تھے۔ دونوں کسی نہ کسی طرح سے نوآبادیاتی تہذیب کی قبولیت پر بھی آمادہ ہیں اس کا اظہار جدید تعلیم کے حصول اور انگریزی وضع قطع کو اختیار کرنے کو برا نہ سمجھنے سے بھی ہوتا ہے۔ عبداللہ حسین کا تعلق ناول نگاروں کی تیسری نسل سے ہے اور ان کا ناول ''اداس نسلیں'' نوآبادیاتی غلبے کے ختم ہونے کے بعد وجود میں آیا لیکن ان کے تخلیقی عمل پر بھی نوآبادیاتی تہذیبی اثرات اور ان کی قبولیت کے سائے لہراتے ہیں۔ یعنی تینوں ناول نگار نوآبادیاتی تمدن کو یکسر مسترد نہیں کرتے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اگر تینوں ناول نگاروں کے تخلیق کردہ کردار 'نعیم' کو ان کی ذاتی شخصیت سمجھ لیا جائے تو بھی تہذیبی قبولیت کے اعتبار سے یہ کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ مثلاً 'لندن کی ایک رات' کا 'نعیم' برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مقیم ہے۔ سستی اور کاہلی اس کی شخصیت کا حصہ ہے۔ یورپ کی آزاد فضا کو وہ ہندوستان کی غلام فضا پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی صورتحال عزیز احمد کے ناول 'گریز' کے کردار 'نعیم' کی بھی ہے۔ اس کے کرداری تضادات سے قطع نظر وہ بھی ہندوستان کی غلام تہذیب کا جب یورپ کی آزاد تہذیب سے موازنہ کرتا ہے تو وہ یورپی تہذیب کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ دونوں 'نعیم' کردار یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے تھے۔ اس لیے ان کا تہذیبی مکالمہ یورپی افراد سے بکثرت دیکھنے میں آتا ہے لیکن 'اداس نسلیں' کا نعیم یورپ جنگ کے لیے گیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سینئر کیمبرج کے درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 'اداس نسلیں' کا نعیم ایک تعلیم یافتہ فرد کی نظر سے یورپ کے تہذیبی ماحول کا احاطہ کرتا لیکن شاید سرحدوں پر مامور رہنے کے باعث یا اپنی روایتی جھجک یا اپنی شخصیت کے متضاد دوطرفہ عمل کے باعث وہ ایسا نہیں کر پاتا۔

'لندن کی ایک رات' کا 'نعیم' لندن میں ہی مقیم رہتا ہے البتہ یورپ میں پیدا ہونے والے اشتراکی افکار کی بازگشت بخوبی سن سکتا ہے اور اسے چونکہ علم و ادب سے دلچسپی ہے، اس لیے وہ نئے نئے آنے والے افکار اور نظریات کی تشنگی رکھتا ہے۔ البتہ 'گریز' کا 'نعیم' جو کہ آئی سی ایس کی تربیت حاصل کرنے گیا ہے۔ وہ براہ راست یورپ میں پیدا ہونے والی اقتصادی تبدیلی کی لہر کو محسوس نہیں کرتا مختلف کرداروں کے تناظر میں وہ اشتراکی فکر و فلسفہ سے آگاہ ہوتا ہے ورنہ اس کی زیادہ توجہ اپنی انگریز خواتین دوستوں کے بوسے لینے پر مرتکز رہتی ہے۔ 'اداس نسلیں' کا 'نعیم' جنگ پر موجود دیگر ہندوستانی سپاہیوں کی طرح اس مخمصے کا شکار ہے کہ وہ کس قوم کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جب فرانسیسی ہندوستانی سپاہیوں کو دیکھ کر اپنے ہیٹ اتار کر اور تالیاں بجا کر ان کا سواگت کرتے ہیں کہ وہ انھیں آزادی دلانے آئے ہیں تو نعیم کا طرز عمل وہاں کے لوگوں کے خوشنما لباس کی تعریف تک محدود رہتا ہے:

> وہ دس میل کے روٹ مارچ سے تھک کر لوٹے تھے فرانسیسی طرز تعمیر باغات کی فراوانی اور غیر ملکی پھول اور پودوں کو دیکھ کر وہ بچوں کی طرح مسرور تھے۔ اتنے دنوں تک اکتا دینے والے یک رنگ ریگستان اور پتھریلی پہاڑیوں کے نظارے کے بعد فرانس کی کھلی سڑکوں پر خوبصورت خوش رنگ عورتیں اور بڑے بڑے ہیٹ پہنے خچر سوار مرد جوان کو گزرتا دیکھ کر ہیٹ اٹھا کر سلام کرتے تھے، انھیں بہت بھلے معلوم ہوئے۔[۱]

تینوں 'نعیم' کردار جدید تعلیم کے حامل ہیں۔ استعماری عہد میں تعلیم کا مقصد افراد کی ذہنی اور تہذیبی تشکیل ایسے خطوط پر کرنا تھی کہ جہاں وہ ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی مغربی تہذیب کے حامل ہوں اور اپنے تاریخی تہذیبی رشتوں سے قطع تعلق کرلیں۔ 'لندن کی ایک رات' کا نعیم باقی دو نعیم کرداروں سے زیادہ دانشور کردار تھا لیکن وہ فکری مباحث سے آگے نکل کر خود کو کسی عمل پر آمادہ نہ کرسکا۔ حتیٰ کہ وہ اپنا تاریخ سے متعلق مقالہ مکمل کرنے میں بھی پس و پیش کا شکار ہے گو کہ اس کے سامنے بھی تعلیم کی تکمیل کے بعد مادی فوائد موجود ہیں اور وہ اپنے مادی مفادات کا حصول چاہتا بھی ہے لیکن اس کا سستی اور کاہلی پر مبنی کردار اس سارے عمل میں رکاوٹ ہے۔ 'گریز' کا 'نعیم' آئی سی ایس مکمل کرتا ہے اور ہندوستان واپس آ جاتا ہے، اس حد تک وہ اپنے پیش رو 'نعیم' سے بہتر ہے کہ وہ دیار غیر جو بنیادی غایت لے کر گیا تھا، اسے مکمل کر کے لوٹا ہے۔ لیکن زندگی کا کوئی اعلیٰ یا ارفع نصب العین اس کے سامنے بھی نہیں ہے۔ تیسرا 'نعیم' جو کہ 'اداس نسلیں' کا ہیرو ہے، وہ یورپ سے وکٹوریہ کراس یعنی جنگ میں بہادری کا اعلیٰ برطانوی اعزاز لے کر لوٹتا ہے لیکن نہ فوج میں شامل ہوتے وقت اور نہ ہی زخمی ہو کر واپس آتے وقت اس کے پاس زندگی کا کوئی نقشہ ہے۔

تینوں نعیم کردار تہذیبی الجھاوے کا شکار ہیں۔ وہ نہ تو مغربی تہذیب مکمل طور پر قبول کر رہے ہیں گو کہ بظاہر وہ اس تہذیب کے حامی ہیں اور بظاہر اسے قبول کر رکھا ہے، اور نہ ہی وہ اسے رد کر پا رہے ہیں۔ تہذیبی رد و قبول کی یہ ہچکچاہٹ دراصل اس عہد کے افراد کے ذہنوں میں استعمار کی پیدا کردہ ہے ۔ کیونکہ یہ احساس لوگوں کے ذہنوں سے نہیں نکل سکتا کہ ان کے آقاؤں یا حکمرانوں کا تعلق ان کی زمین اور ان کی ثقافت سے نہیں ہے۔ اس لیے اس دور کا برصغیر ایک ایسے تہذیبی دوراہے پر تھا کہ جہاں وہ اپنے تہذیبی رشتوں سے رابطہ استوار کرے تو باغی ٹھہرتا ہے، جاہل گنوار اور دقیانوسی قرار پاتا ہے اور اگر مغربی معاشرت قبول کرے تو مادی لذتوں کا حصول تو ممکن ہے لیکن اس کی روحانی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ اسی لیے تینوں ناولوں کے کردار 'نعیم' آزاد خیال ، لاابالی اور کسی سطح پر زندگی کی بے معنویت اور لایعنیت کا شکار ہیں یعنی زندگی کی مادی کشش ہی اصل حیات ہے اور تینوں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں البتہ 'اداس نسلیں' کا نعیم باقی دونوں کرداروں کی بہ نسبت تاریخ کے لمبے عرصے میں سفر کرتا ہے۔ اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے استعمار سے آزادی کو اپنا مقصد حیات بناتا ہے جیسا کہ پہلے وہ شدت پسند گروہ میں شامل ہوتا ہے اور پھر کانگریس میں پرامن جدوجہد کو اہم سمجھ کر شامل ہو جاتا ہے۔ آزادی کی اس خواہش کے لیے وہ جیل بھی چلا جاتا ہے۔

تینوں ناولوں کے ہیرو 'نعیم' سرکاری ملازمت کے حصول کی خواہش رکھتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' ناول میں 'نعیم' کی یہ خواہش مکمل ہوتے ہوئے نہیں دکھائی گئی لیکن 'گریز' کا نعیم سرکاری افسر بن کر لوٹتا ہے اور کشمیر میں اپنے آقاؤں کی خدمات بجا لاتا ہے جب کہ 'اداس نسلیں' کا نعیم انگریز فوجی افسر کے منع کرنے کے باوجود خلاف توقع ان پڑھ نوجوانوں کے ساتھ فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔

تینوں نعیم کردار سامراج سے بیزاری کا اظہار کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی بیزاری عملی اظہار نہیں پاسکتی یعنی عمل کی قوت سے محرومی تینوں کرداروں کی مشترک صفت ہے۔

تینوں 'نعیم' کردار یہ قوت بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنے عصر کی بدلتی ہوئی صورتحال اور اس کے رجحانات کی عکاسی کر سکتے ہیں کم وبیش تینوں کردار ایسا کرتے بھی ہیں لیکن تہذیبی الجھن، اندرونی کشمکش، سماجی انتشار اور خارجی دباؤ تینوں کو کوئی واضح سمت متعین کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں گویا تینوں کردار ہندوستان کے اس طبقے کی تہذیبی نمائندگی کر رہے ہیں جو سامراج سے اپنے مفادات بھی حاصل کر رہا ہے، مادی ثمرات بھی سمیٹ رہا ہے اور مزاحمت بھی کرنا چاہتا ہے یعنی تینوں کردار برصغیر کی نوآبادیاتی عہد کی تہذیبی دوعملی کو نمایاں کر رہے ہیں۔ تہذیبی اعتبار سے تینوں کردار جنسی گھٹن کا شکار ہیں۔ 'لندن کی ایک رات' کا 'نعیم' انگریز خواتین کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس دوستی کو جنسی تعلق میں بدلنا چاہتا ہے لیکن اکثر وبیشتر وہ ایسا نہیں کر پاتا۔ 'گریز' کا 'نعیم' انگریز خواتین کے ساتھ دوستیاں پیدا کر لیتا ہے۔ 'نعیم' کا کردار بوس وکنار تو خوب کرتا ہے لیکن جنسی آگ اپنی جھجک کے باعث کم ہی بجھا پاتا ہے۔ یہی جھجک ''اداس نسلیں'' کے نعیم کو بھی دامن گیر ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی دباؤ میں آئی ہوئی فضا اور عام افراد کی جدید علوم سے رغبت، مذہبی تشکیک پسندی، نئی سیاسی حرکیات اور نئے تاریخی رشتوں کے باعث عام ہندوستانی گومگو کی کیفیت کا شکار ہے۔ نعیم کردار گو کہ تکنیکی اعتبار سے اپنے اپنے ناولوں میں کوئی ارتقائی کیفیت کا مظاہرہ نہیں کر سکے لیکن اس ساری صورتحال کی عکاسی بخوبی کرتے ہیں۔ تینوں کرداروں کی مماثلت محض اتفاقی ہے۔ مگر اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے تخلیق کار ایک جیسے تخلیقی احساس کے حامل ہیں اور ان کے سوچنے اور تجزیہ کرنے کے عمل میں بھی اشتراکات موجود ہیں۔ ایک سطح پر تو یہ عمل مثبت ہے کہ تینوں تخلیقی فنکار برصغیر کے تاریخی وتہذیبی پس منظر اور اس کی مبادیات پر ایک جیسا تخلیقی شعور رکھتے ہیں لیکن بہ ایں معنی یہ عمل منفی جہات کا بھی حامل ہے کہ پہلے 'نعیم' کے تخلیق کے زمانے ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک تخلیق کاروں کی تخلیقی سوچ اور شعور میں کوئی بڑی اور ناگزیر تبدیلی پیدا نہیں ہوسکی بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو 'اداس نسلیں' کا نعیم زیادہ مجہول اور بے عمل کردار لگنے لگتا ہے اور اس کے تضادات دیگر دو کرداروں کے بہ نسبت شدید ہیں دراصل یہ اس کے عہد کے تضادات بھی ہیں۔ تینوں کردار وقت کی دھول میں گم ہو کر بے چہرہ ہو جاتے ہیں گویا تینوں ہی کسی وجودی مسئلے کا شکار ہو جاتے ہیں ان کا انجام بھی کم وبیش ایک جیسا ہے۔

نوآبادیات ایسا نظام حکومت ہوتا ہے جس میں ایک عسکریت پسند ریاست کسی دوسری ریاست پر براہ راست اپنا عسکری، سیاسی، معاشی، تجارتی اور تہذیبی و ثقافتی تسلط قائم کر لیتی ہے۔ اسی طرح فاتح یا سامراجی ریاست اپنے اقتدار کو وسعت دے کر اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتی ہے اور مقامی افرادی قوت اور وسائل کو اپنے تصرف میں لے آتی ہے۔ اس طرح ایک ایسی صورتحال جنم لے لیتی ہے جس میں مقامی افراد خود اپنے وسائل اپنے سامراجی آقاؤں کو پیش کر دیتے ہیں جب کہ نوآبادکار مقامی ہنرمندوں اور دستکاریوں کی ہر سطح پر حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ نوآبادیات کے غلبے میں جدید اور قدیم کی آویزش بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے مثلاً یورپ اپنے عہد تاریک کی پسماندگی اور جہالت سے نکل کر سائنسی اور صنعتی ترقی کے زینے طے کرنے لگا۔ جب کہ برصغیر کی تہذیبی فضا ان جدید علوم سے کوسوں دور تھی جو یورپ کی ترقی کا باعث تھے۔ اس طرح نہ صرف سامراج کے رد وقبول کا مخصہ برصغیر کے لوگوں کے اذہان کو منتشر کر رہا تھا وہیں قدیم و

جدید تمدن کی آویزش نے بھی انھیں رد و قبول کے دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ تہذیبی ہیجان اور رد و قبول کی اسی آویزش کا اظہار اردو ناول کے ابتدائی دور میں نظر آتا ہے لیکن اس کا جھکاؤ یا تو نئے نظام کی قبولیت کی طرف ہے یا محض صورتحال کی عکاسی تک محدود ہے۔

نوآبادکار نوآبادی سماج اور اس کے کردار کو ہر سطح پر متاثر کرتا ہے۔ ابتداً لوگ سامراجی احکامات کی مزاحمت کرتے ہیں لیکن جب زندگی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو انھیں طوعاً و کرہاً سامراج کا ساتھ دینا پڑتا ہے یہیں ایک مفاد پرست طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ سامراج کا ساتھ دینے میں ہی بھلائی ہے یا اس طبقے کو اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان کے حصول کے لیے سامراج کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک دوسری صورت بھی پیدا ہوتی ہے جہاں افراد نوآبادیاتی صورتحال کا سامنا بہادری سے کرنے کے بجائے دیگر راستے اختیار کرتا ہے۔ مثلاً مقامی طبقات یہ نہیں چاہتے کہ ان کے ہنر مند افراد بے روزگار ہو جائیں اور ان کی دستکاریاں ختم ہو جائیں۔ جب کہ نوآبادکار زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے جبر کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے اس طرح مقامی طبقات میں بہادری کے بجائے نوآبادیاتی تجربہ ایک خاص طرح کی چالاکی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ چالاکی نہ صرف ان طبقات میں پیدا ہوتی ہے جو نوآبادکار کا ساتھ نہیں دینا چاہتے بلکہ ان لوگوں میں بھی پیدا ہوتی ہے جو نوآبادکار کا ساتھ دے کر اپنے مفادات کا حصول چاہتے ہیں۔ جبر اور خوف کی فضا میں ایسے افراد اکثریت میں ہو جاتے ہیں جو حالات سے مقابلہ کے بجائے نوآبادکار یا سامراج کا ساتھ دے کر اپنا مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً ''لندن کی ایک رات'' کا ایک کردار عارف جو آئی سی ایس کے لیے منتخب ہونا چاہتا ہے اس کی ایک کیفیت یوں ہے:

> اسے امید تھی کہ اس طرح سے نہ صرف اس کی انگریزی زبان کی مہارت بہتر ہو جائے گی۔ بلکہ ''ٹائمز'' اخبار کے خیالات اس کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔ اس اخبار کا نقطہ نظر انگلستان کے ''بڑے صاحبوں'' کا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ جو بات ''ٹائمز'' میں چھپ جائے اسے ''نیم سرکاری'' سمجھنا چاہیے۔ عارف چاہتا تھا کہ وہ سرکاری خیالات میں بالکل ڈوب جائے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امپیریلسٹ ممتحنوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔ اوروں کی رائے کو اپنا بناتے بناتے اس کا دماغ گراموفون کی طرح ہوگیا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا۔ جھوٹے نقلی سکے استعمال کرنے کی اس کو اتنی عادت ہوگئی تھی کہ وہ انھیں سچا سمجھنے لگا تھا۔[۲]

چالاکی اور سامراجی آقاؤں کی خوشنودی کے ذریعے اپنے مفادات کے حصول کی ایسی ہی مثال ''گریز'' میں بھی ملتی ہے بلکہ ''گریز'' کا ہیرو نعیم تو اس کی واضح مثال ہے۔ نعیم کا مقصد محض اپنے آقاؤں کی خوشنودی ہے چاہے اس کے لیے اسے اپنی تہذیبی اقدار کو تج دینا پڑے۔ ''گریز'' کے ایک اور کردار 'عاقل خان'' بھی اپنے مفادات کے حصول کے لیے ایسی ہی ابن الوقتی کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنی بیٹی بلقیس کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور انگریزی کپڑے پہناتے ہیں جب کہ خود میٹرک میں فیل ہونے کے باوجود سماج میں اعلیٰ درجہ اپنی ہوشیاری سے حاصل کرتے ہیں:

عاقل خان بیچارے میٹرک فیل تھے۔ پہلے وکالت درجہ سوم کا امتحان دیا۔۔۔ کچھ عہدہ داران مال و عدالت کی توجہ سے ان کا کام چل نکلا اس کے بعد جوڈیشنل امتحان پاس کیا اور وکیل درجہ اول ہوگئے، اپنے نام کے آگے وکیل ہائی کورٹ لکھنے لگے۔ قحط کے زمانے میں تھوڑی بہت جائیداد پیدا کرلی اور اس زمانے میں جب کہ صفدر نگر تقریباً دلدل اور ملیریا کا گھر تھا، بہت سی زمین خرید لی۔ اس کے بعد جب صفدر نگر شہر کے بہت اچھے محلوں میں گنا جانے لگا اور وہاں بہت سے مکانات بن گئے تو زمین بہت منافع کے ساتھ بیچی۔ صرف ایک پلاٹ اپنے پاس باقی رکھا اور اس پر بہت اعلیٰ درجے کا جدید وضع کا مکان بنوا لیا۔ یہ وضع حیدرآباد میں ''جرمن ڈیزائن'' کے نام سے مشہور ہے۔[۳]

عہد نوآبادیات میں ایسی صورتحال یا ایسی مثالیں اکثر دیکھی جاسکتی ہیں ''اداس نسلیں'' کا ہیرو ''نعیم'' بھی ایسی ہی ایک مثال ہے جو اونچے مرتبے والے خاندان کی لڑکی عذرا سے شادی کرنے کے لیے عذرا کے کہنے پر سامراجی فوج کا حصہ بن جاتا ہے اور ''وکٹوریہ کراس'' لے کر لوٹتا ہے اور پھر اس وکٹوریہ کراس اور اس کے صلے میں ملنے والی زمین دونوں پر فخر کرتا ہے۔ نعیم کے علاوہ اپنے مفادات اور اعلیٰ سماجی مرتبے کے حصول کی ایک اہم مثال ''اداس نسلیں'' میں روشن آغا کی بھی ہے:

> یہ تو بہرحال سب کے دیکھے کی بات تھی کہ جب تک کرنل جانسن ہندوستان میں رہے۔ ہمیشہ شکار کے لیے روشن پور آتے رہے اور جب روشن آغا یورپ گئے تو انھیں کے پاس ٹھہرے اور فیض پایا۔
>
> اس طرح روشن پور کی جاگیر، جو پانچ سو مربعوں پر محیط تھی، قیام میں آئی، واحد مالک روشن آغا تھے۔
>
> روشن آغا اپنے معمولی پس منظر کے باوجود اس عظیم ذمہ داری کے پوری طرح اہل ثابت ہوئے جو اس بیش بہا خلعت اور جاگیر کی نوازش سے ان پر آپڑی تھی۔ آخری عمر میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے ولایت بھیجا۔[۴]

نوآبادیاتی فکر نوآبادیاتی باشندوں کی شعوری حیثیت کو ایک خاص سطح تک ترقی دینے کے حق میں ہوتی ہے۔ سائنسی علم کو ایک خاص سطح تک لوگوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے ہنرمند پیدا نہیں ہونے دیئے جاتے جو نئی اختراعات کریں انھیں فقط خراب مشین کو ٹھیک کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ خالص ترقی کے لیے کوئی خاص ہنر محض سیکھ لینا اہم نہیں ہوتا بلکہ اس ہنر میں نئی اختراعات اور مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن نوآبادکار اپنے استحصالی عمل کو دوام دینے کے لیے مقامی باشندوں تک ایسے علوم کی ترسیل ناممکن بنائے رکھتا ہے۔ اس طرح نئی نئی اختراعات و ایجادات کے حوالے سے نوآبادکار کی ذہنی اُپج کی ہیبت برقرار رہتی ہے اور یوں اس کی علمی برتری کی دھاک کے سامنے نوآبادیاتی باشندہ سرِتسلیم خم رکھتا ہے۔

سامراجی برتری قائم رکھنے کے لیے زبان ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اسی لیے ہندوستانی معاشرے میں انگریزی زبان کی اہمیت برقرار رکھی گئی۔ فارسی جو پہلے ریاستی اور دفتری زبان تھی اس کے متروک ہو جانے

سے عام ہندوستانی مسلمانوں میں احساس محرومی بڑھ گیا۔ نوآبادیات نے انگریزی زبان اور آمرانہ قوانین لاگو کر کے اپنی حیثیت کو مستحکم کیا۔ مقامی زبانوں میں تفریق ڈال کر مقامی باشندوں میں لسانی تعصّبات کو ہوا دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ مقامی زبانوں کی نامکمل حیثیت کا احساس بھی اجاگر کیا گیا۔ اور نوآبادکار کی زبان کو مکمل اور علمی زبان کا درجہ دے کر پیش کیا گیا۔ بقول ناصر عباس نیر:

> نوآبادیاتی صورتحال ذولسانیت کو جنم دیتی ہے۔ مگر دونوں زبانیں برابر رتبے کی نہیں ہوتیں نوآبادکار کی زبان اسی کی مانند مہذب اور افضل ہوتی ہے جب کہ نوآبادیاتی اقوام کی زبانیں گنوار لوگوں کی زبانیں اور ناشائستہ ہوتی ہیں زبان کا اقداری درجہ اس کے بولنے والوں کی نسبت سے متعین ہونے لگتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زبان ایک آلہ اظہار کے بجائے ''علامت رتبہ'' بن جاتی ہے۔[۵]

برصغیر کے باشندوں کے سماجی استحصال کے لیے عام لوگوں میں ان کی اپنی زبان اور ثقافت سے بے زاری کا احساس پیدا کیا گیا۔ نوآبادکار یہ احساس اس لیے پیدا کرتا ہے کہ نوآبادیاتی باشندہ اس بات پر قائل ہو جائے کہ اس کے زوال کا سبب خود ان کا اپنا قدیم نظامِ سیاست اور پرانی تہذیبی اقدار ہیں۔ جب کہ نوآبادکار اس معاملے میں بے قصور ہیں ۔ بلکہ وہ جو نظام لائے ہیں اس کی افادیت مسلم ہے کیونکہ ان نئے حکمرانوں کی وجہ سے عوام نئے علوم سے روشناس ہوئے ہیں ذہنوں کو نئے حالات کے تحت وسعت ملی ہے اور طرزِ فکر میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح ہندوستان میں دو طبقے پیدا ہوئے ایک قدامت پسند اور دوسرے جدید خیالات اور علوم کے حامی لوگ تھے۔

مذکورہ تینوں ناولوں میں کہانی کی بنیادی ساخت اسی کشمکش پر مبنی ہے کہ کیا نوآبادکار کے لائے ہوئے نظام سے فیض یاب ہوا جائے یا اس کے برعکس عمل کیا جائے البتہ یہ عمل قابل غور ہے کہ نوآبادکار مزاحمت کے تمام فطری راستے مسدود کر دیتا ہے مزاحمت نہ کر سکنے کی وجہ سے افراد میں جو بے زاری اور اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے اس کی زیادہ بہتر مثال ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب کہ ''اداس نسلیں'' کے نعیم کا شدت پسند گروہ میں شامل ہو جانا بھی اس کی مثال ہے۔ ''گریز'' کے نعیم کا اس سارے عمل سے لاتعلقی اختیار کر لینا بھی مزاحمت ہی کی ایک مثال ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اردو ناول میں بالعموم اور مذکورہ تینوں ناولوں میں بالخصوص نوآبادیات کے خلاف کسی سطح پر مزاحمت دکھائی دیتی ہے؟ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ کیا نوآبادیاتی سیاست اور اس کے تشکیل کردہ معاشی ڈھانچے میں مزاحمتی ادب تخلیق کرنا ممکن بھی ہے؟

برصغیر میں ناول دراصل یورپ سے مستعار لیا گیا ہے۔ یورپ میں جو ناول لکھے جا رہے تھے وہ اپنے عہد کے بدلتے ماحول کی نمائندگی کر رہے تھے جیسا کہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> یورپ میں ناول کا فن اس وقت وجود میں آیا جب وہاں صنعتی انقلاب آیا اور ناول کے لیے جو فضا ہونی چاہیے تھی وہ اس کو ملی۔ نیا سماجی شعور آیا، نئے کردار آئے اور سارے کردار اچانک بے حجابانہ طور پر سماج کے اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے سماج کو اپنی قوت، اپنی باطنی طاقت کا جب احساس ہوا تب ناول وجود میں آیا۔[۶]

برصغیر میں ناول انگریزی اثرات کے ساتھ آیا اور ناول نگاری کا آغاز کرنے والے لوگ انگریز طبقے کے بہی خواہ تھے۔ یعنی سامراج کے تنخواہ دار طبقے نے اردو ناول کی صنف کی نشوونما کی طرف توجہ دی اس طرح شعوری طور پر ناول نوآبادیاتی سوچ کے تابع اور اس کی فکریات کا ترجمان بن گیا۔ برصغیر میں موجود داستانوں کی مضبوط روایت ایک دم پس منظر میں چلی گئی اور اردو ناول کو آغاز میں ہی اصلاح پسندی کے غالب رجحان نے گھیر لیا۔ اصلاح پسندی کی یہ روایت سرسید نے پیدا کی اور اس کی بنیادی غایت انگریزوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا بلکہ ان کی تہذیبی برتری کو قبول کرنا تھا۔ ''اسباب بغاوت ہند'' میں سرسید نے جو وجوہات تلاش کیں، وہ اسی امر کی غماز ہیں کہ نوآبادکار حکمران تہذیبی ، سماجی اور علمی اعتبار سے برتر ہیں۔ جب کہ مقامی اقوام غیر مہذب اور تعلیمی پسماندگی کا شکار ہیں۔ شاید اسی احساس کمتری کے پیش نظر اور اپنے ہم جنسوں کے اخلاق سدھارنے کے لیے سرسید نے اپنے رسالے کا نام ''تہذیب الاخلاق'' رکھا۔ ایسے ہی معاون کار طبقات کو ساتھ ملا کر نوآبادکار سامراج نے اپنے اقتدار میں وسعت اور استحکام پیدا کیا۔ ہندوستانیوں کو فوج میں جبری بھرتی کروانے کے لیے انگریزوں کے بنائے جاگیرداروں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے بدلے میں نوآبادکار حکومت انھیں مزید انعام و اکرام سے نوازتی تھی۔ ''اداس نسلیں'' میں روشن آغا خاندان اس کی نمایاں مثال ہے۔ برصغیر کے طبقات نے بالعموم اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد بالخصوص عسکری مزاحمت کو ترک کر دیا۔ اب نوآبادیاتی تمدن متوسط طبقے کی زندگیوں میں بھی سرایت کر گیا کھانا کھانے کے طریقہ کار سے لے کر کھانے کے اوقات کے تعین تک مغربی انداز کو اپنا لیا گیا۔ ہندوستانی لباس میں تبدیلی آئی کوٹ اور پتلون کا رواج ہوا۔ ٹوپی اور پگڑی متروک قرار دیئے گئے حتیٰ کہ تعمیرات کے انداز میں نقالی اور تقلید کو معیار بنا لیا گیا۔

''لندن کی ایک رات'' کا نعیم اس بدلتے ہوئے تمدن کی واضح مثال ہے۔ واضح سیاسی و سماجی شعور رکھتے ہوئے بھی نعیم اور ناول کے دیگر کردار شراب اور نوجوانوں کے دیگر مشغلوں میں گھرے ہوئے ہیں اور یہی نوآبادیاتی تمدن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے تقریر تو خوب کر لیتے ہیں لیکن عمل کی قوت سے محروم ہیں۔ عمل کی یہی قوت مزاحمت پر ابھارتی ہے لیکن نوآبادیاتی سیاسی اور معاشی گھن چکر نے ان کے اندر سے مزاحمت کا احساس ختم کر دیا ہے۔ مثلا ''لندن کی ایک رات'' کا نعیم ایک ہمدرد کردار ہے۔ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتا ہے لیکن اس کی ہمدردی کا یہ جذبہ اس وقت بیدار نہیں ہوتا جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ نوآبادکار حکمران دراصل اس کا ااور اس کے ہم جنسوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ''گریز'' کا نعیم تو نوآبادکار حکمرانوں کا معاون کار ہے وہ آئی ۔سی ۔ایس کرنا ہی اس خواہش کے ساتھ چاہتا ہے کہ نہ صرف مستقبل سنوار سکے بلکہ وہ ہندوستان پر حکمرانی کر سکے۔ دراصل حکمرانی کا یہ احساس بھی اسے نوآبادکار حکمران نے بخشا ہے۔ کیونکہ وہ محکوم ملک کا فرد ہے اور محکوم کبھی حکمرانی نہیں کرتے:

> جب وہ ہندوستان واپس ہوگا تو اس کے قدموں کے نیچے ہندوستان کی مٹی تھرائے گی۔ اس سے زیادہ قابل اور تیز دماغ نوجوان جنہوں نے اپنے قومی یا اشتراکی جنون میں آئی۔سی۔ایس کی طرف توجہ نہیں کی اور پھر پچھتا کے یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہوگئے یا آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگئے، اس کی طرف حسد سے دیکھیں گے۔ اس وقت خانم قدموں پر گر کے اپنی لڑکی کا اس سے بیاہ کریں گی۔[۷]

عزیز احمد اپنے کردار نعیم کی سیاحت سے یہ دکھانا چاہتا ہیں کہ سارے یورپ کی تہذیبی فضا کیسی ہے۔ یورپ کی یہ آزادی اور ہندوستان کی محکومی کا تقابل کرتے ہوئے 'گریز' کے نعیم کو بھی اپنی غلامی کھلتی ہے۔ ''گریز'' کا نعیم ہندوستانی معاشرت کو یکسر بھلا دینا چاہتا ہے اس لیے جب وہ یورپ پہنچ جاتا ہے تو ہر ہندوستانی طالب علم سے دور رہنے کی کوشش رہتا ہے:

> بہت سے بد دماغ اور غلط خیال ہندوستانی طالب علموں کی طرح اس کا بھی یہ اصول تھا کہ ہندوستان واپس جا کے تو اپنے ہم وطنوں میں ساری عمر گزارنا ہی ہے، ان سے یورپ میں جس قدر بچو اچھا ہے۔ اس کے دوست سب کے سب انگریز، یورپین اور امریکی تھے۔[۸]

گویا ''گریز'' کے نعیم کی ذہنی حالت مفلوج ہے نعیم اپنے زمانے کی تہذیبی انتشار کی پروردہ نسل کا نمائندہ ہے۔ تہذیبی انتشار کے باعث اس نسل کو منزل کا تعین کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ناول کا عہد عزیز احمد کا اپنا عہد بھی ہے۔ اس لیے وہ اس دور کی ترجمانی بہتر انداز میں کر سکے ہیں البتہ نعیم کا کردار مجہول نظر آتا ہے۔ اسے جو کچھ نوآبادکار نے ازبر کرا دیا ہے وہ اس سے آگے نکل کر سوچنا ازخود کوئی عمل کرنا غلط سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کی مزاحمت کی قوت سلب کی جا چکی ہے اور وہ نوآبادکارانہ نظام کا محض پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔

''اداس نسلیں'' کا نعیم اپنے پیش رو نعیم کرداروں سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ وکٹوریہ کراس کا حامل ہونے کے باوجود آزادی کی خواہش اس کے من میں جاگتی ہے اور وہ اس خواہش کا پالن کرنے کے لیے ایسے گروہ میں بھی شامل ہو جاتا ہے جو عسکری مزاحمت کو شعار بنائے ہوئے ہے لیکن جلد ہی نہ صرف وہ خود پرامن راستے کی طرف نکل آتا ہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دہشت پسندی کا وطیرہ چھوڑ دیں:

> ان لوگوں سے بچ کر تم کہاں جا سکتے ہو! اس جنگ میں سبھی شریک ہیں۔ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ اس میں کتنے جاگیردار، کتنے مالک اور کتنے نوکر ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ ہم چند آدمی غاروں میں چھپ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ درندوں کی زندگی اور درندوں کی جنگ ہے۔ ہم اپنے والدین کی نسبت بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے محنت کی اور خاموش رہے۔ بڑی خاموش، بڑی طاقتور جنگ، ہم نہ محنت کرتے ہیں نہ جنگ کرتے ہیں، محض چوری کرتے ہیں۔[۹]

نوآبادکار کے پیدا کردہ جبر کے نظام کے سامنے نوآبادیاتی باشندے جب مزاحمت نہیں کر سکتے تو وہ مزاحمت کی کم تکلیف دہ صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک صورت کی طرف درج بالا اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے خاموشی اختیار کر لی۔ نئے نظام کی ہیبت اور اثر انگیزی کے علاوہ نوآبادکار کے اعانت کار گروہ نے بھی مقامی افراد کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ انگریز ''سویلائزیشن کے پیغمبر'' ہیں ان کے خلاف مزاحمت کسی طور پر بھی جائز نہیں بلکہ ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے بادشاہت جیسے فرسودہ ادارے سے برصغیر کی جان چھڑائی ہے۔

''اداس نسلیں'' کا نعیم چونکہ جنگ کی تباہ کاری دیکھ چکا ہے۔ وہ شاید اس لیے بھی عسکری مزاحمت کے حق میں نہیں

اور اس کے لاشعور میں کہیں انگریز طبقات کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی موجود ہے کیونکہ وہ اسی نظام اور سرکار کا انعام یافتہ بھی ہے شاید اس لیے بھی خود کو کسی مشکل سے دوچار کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ ویسے بھی نعیم کے کردار میں مستقل مزاجی نہیں ہے۔ جب سامراج سے مزاحمت کی ضرورت تھی اور عام کسان سامراج کے مخالف کھڑا تھا اس وقت نعیم رضا کارانہ فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب سامراج کے خلاف مزاحمت اپنے عروج پر تھی اس وقت نعیم محکمہ تعلیم کے انڈر سیکرٹری کے طور پر حکمرانوں کی خدمت پر مامور ہو جاتا ہے۔ دراصل نعیم جن طبقات سے خود کو وابستہ کرنا چاہتا ہے وہ مزاحمت کار نہیں بلکہ نوآبادیات کے اعانت کار ہیں۔

نوآبادیات کا تجربہ بہادری کے جذبات کو مجروح کر دیتا ہے اور ایک خاص قسم کی چالاکی کو فروغ دیتا ہے۔ لوگ حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے حکمرانوں کا ساتھ دے کر اپنے مفادات کا حصول یقینی بناتے ہیں۔ نوآبادکار ازخود بھی ایسے طبقات کو جنم دیتا ہے جو اس کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے باقی لوگوں کو یہ دکھایا جاتا ہے جیسے یہ طبقات اقتدار کا ساتھ دے کر ثمرات سمیٹ رہے ہیں باقی کے طبقات بھی ایسا طرز عمل اپنا کر ثمرات لے سکتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات''، ''گریز'' اور ''اداس نسلیں'' کے دیگر کرداروں کے علاوہ مرکزی کردار 'نعیم' بھی اس کی نمایاں مثال ہیں۔ یعنی تینوں نعیم کردار سامراج کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں تو ثمرات بھی حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔لوگ جب مزاحمت نہیں کر پاتے تو وہ دلجمعی سے کام نہیں کرتے۔ ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی تھکن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دراصل غیر فعال مزاحمت ہے یعنی وہ لگن سے کام کرنے کے بجائے کام سے جی چراتے ہیں۔ تینوں نعیم کرداروں میں اس پہلو کی جھلک موجود ہے۔ یہ تھکاوٹ نو آبادیاتی باشندے پر اس لیے بھی طاری ہو جاتی ہے کیونکہ اسے برابر یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ میری محنت کا ثمر تو کوئی اور لے جاتا ہے اس طرح اکثر طبقات نو آبادکارانہ دباؤ کی وجہ سے انفعالیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔نعیم کرداروں کے ذریعے ناول نگاروں نے اس دور کی مستقل سمجھی جانے والی تہذیبی قدروں کی شکست وریخت دکھائی ہے۔ دور جدید جو نئے علوم اور افکار لے کر آیا ہے، اس نے ایک پوری نسل کے اذہان میں اضطرابی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مغربی سیاست نوآبادیاتی ملکوں کے لیے اہل مغرب کے دوہرے معیار، اخلاقی ابتری، ثقافتی اور معاشرتی زندگی کی جھلک ان ناولوں میں جابجا نظر آتی ہے۔

نوآبادیاتی نظام طاقت ور گروہوں کو تقسیم کر دیتا ہے تاکہ وہ مزاحمت کے قابل نہ رہیں۔ تینوں نعیم کردار ایسے کسی گروہ کا مستقل ساتھ دیتے نظر نہیں آتے جو مزاحمت کے قابل ہیں۔تینوں نعیم کردار جنسی لذت کے قائل ہیں یوں دراصل وہ مزاحمت کے دباؤ سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تینوں نعیم کردار دراصل اعانت کار گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔''اداس نسلیں'' کا ہیرو 'نعیم' اگر کچھ دیر کے لیے مزاحمت پر آمادہ ہوتا ہے لیکن جلد ہی وہ بھی تھکاوٹ کا شکار ہو کر سامراج کی اعانت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تینوں نعیم کردار ناول کے اختتام پر بے مقصدیت کی گہری دھند میں گم ہو جاتے ہیں۔ دراصل اپنے اصل مسائل سے لاتعلقی زندگی میں ان کی دلچسپی کو کم کر دیتی ہے اور بے مقصدیت، مغائرت اور سماج سے اجنبیت ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ نوآبادکار کے معاشی اور سماجی نظام کی کامیابی ہے کہ 'نعیم' ایسے باشعور کردار بھی اس کے مزاحم نہیں ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۹۴

۲۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات ، نیا ادارہ، لاہور، طبع چہارم، ۱۹۷۴ء، ص ۴۷

۳۔ عزیز احمد، گریز، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، طبع اول، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱۱

۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۱۳

۵۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۳

۶۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، عبدالحلیم شرر، بحیثیت ناول نگار، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۹۱

۷۔ عزیز احمد، گریز، ص ۱۲۶

۸۔ عزیز احمد، گریز، ص ۱۲۷

۹۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۱۶۶